رموزِ اوقاف:

قوسین ( ): قوسین، قوس (کمان) کی جمع ہے۔

- عبارت میں ایسا جملہ یا بیان جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہو، یا جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً:

احمد کے والد (جو کہ ڈاکٹر ہیں) کل سعودی عرب جا رہے ہیں۔

خط (—):

- یہ علامت جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔ مثلاً:-

میری رائے میں — اگرچہ میں ماہرِ تعلیم تو نہیں ہوں — ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت سی خامیاں ہیں۔

- جب ایک لفظ کی وضاحت میں کئی دیگر الفاظ استعمال ہوں تو لفظ کے بعد یہ نشان لگاتے ہیں۔

سارا مکان — دیواریں، فرنیچر، پردے اور بجلی کا سامان — سب جل کر راکھ ہو گیا۔

سلیم — بلکہ اس کا سارا خاندان — سعودی عرب چلا گیا۔

۶۔ درج بالا رموزِ اوقاف کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دو دو جملے تحریر کریں۔

مولانا محمد حسین آزاد

ولادت: ۱۸۳۱ء

وفات: ۱۹۱۰ء

محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا، جو ایک جید عالم اور مجتہد تھے۔ ان کے والد کے شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ سے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے آزاد نے ذوق کی زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں دہلی کالج میں داخل ہو کر عربی و فارسی کی تحصیل کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آزاد کے والد کی شہادت اور گھر کی تباہی کے بعد اُنھیں دہلی چھوڑنی پڑی۔ مختلف علاقوں میں قیام کیا۔ سات سال بعد لاہور آئے اور بڑی مشکل سے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ یہاں اُنھوں نے عربی اور فارسی میں کچھ درسی کتب لکھیں، جو بہت مقبول ہوئیں۔ لاہور میں انجمنِ پنجاب کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ اپنی ایک جوان اور چہیتی بیٹی کے انتقال سے اُنھیں بے حد صدمہ پہنچا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ تاہم اس دوران میں جب بھی افاقہ ہوتا تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھتے۔

آزاد عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ سنسکرت اور ہندی زبان و ادب کی خوبیوں سے بھی آشنا تھے۔ وہ اُردو اور دیگر مشرقی زبانوں کے بڑے محقق اور ماہر تھے۔ اُن کا شاہکار ''آبِ حیات'' اُردو زبان کی پہلی تاریخی اور تنقیدی و تحقیقی کتاب ہے۔ آزاد کی انشاپردازی بے مثل ہے، وہ ایک ایسے طرز کے بانی تھے، جس کا خاتمہ اُنھیں کے ساتھ ہوا۔ اس طرز سے اُنھوں نے تمثیلی اور تخیلی مضامین میں خوب کام لیا۔

تصانیف: نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس، دربارِ اکبری، نگارستان، آبِ حیات وغیرہ۔

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمھارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں، دوسری عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔

ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں:

”خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدانِ وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں جس کی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسبِ فکر شمار کر سکتا ہے، نہ قلمِ تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ یکا یک قلہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی

طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسے رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا، لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے انبوہِ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت اور اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں، نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں، وہ اگرچہ اقوام مختلفہ اور عہد ہائے متفرقہ، عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں، مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحبِ ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیٔ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندیٔ کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے، پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک کے ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لیے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دُوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاجِ شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباسِ جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علمِ ریاضی اور جرِ ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس

وقت کام میں نہ آرہا ہو۔ اس عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہے۔اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نِقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں تقسیم ہوگیا۔کوہ مذکورہ پر راستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔

مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔اس میدان روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جان بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا، اس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شام وشفق جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی وتشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا۔جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چاروں طرف پھاٹک تھے۔اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری، حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔جس کے میٹھے سروں نے اُن مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ”خیر مقدم! خیر مقدم! خوش آمدید! صفا آور دید“۔اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہوگیا۔ چنانچہ مؤرخوں کا گروہ ایک دروازے پر ایستادہ ہوا تاکہ صاحبِ مراتب اشخاص کو حسبِ مدارج ایوانِ جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔تمام مکان گونج اُٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

دیکھا کہ ایک تختِ طلسمات کو بتیس پریاں اڑائے لیے آتی ہیں۔اس پر ایک راجا بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے کے علما اور مؤرخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری

سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجا تو مہاراجا بکر ماجیت تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے، نہ آپ کا سنہ ہٹے گا، نہ سکّہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جاکر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجا کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزر نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اشیر باد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا، وہ کالی داس شاعر تھا جس نے ان کے عہد میں نو (9) کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگیٔ جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر کا یہی کاروبار جاری تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش، جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہے۔ ایک جوان، پیل پیکر ہاتھ میں گرزِ گاؤسر نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھومتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے، ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں کہ درفشِ کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حُبِّ قوم اور حُبِّ وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سر پر کلۂ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مؤرخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے اسے بچشم تعظیم دیکھا۔ انھی میں سے ایک پیرمرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور کے پڑھے۔ نہیں، بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر

پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گلِ فردوس کا ایک طُرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دُعا کی کہ الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے ۔ تمام اہل محفل نے آمین کہی۔ معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی شیر سیستانی رستم پہلوان ہے اور کہن سال مایوس فردوسی ہے جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حُسنِ شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورّخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا ، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آجاؤ تا کہ تمھاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہِ کیانی اور اس پر درفشِ کاویانی جھومتا تھا مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا کہ گویا اپنے زخم کو بچاتے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اُس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی ۔ وہ دارا بادشاہِ ایران تھا۔

بعد اس کے جو شخص آیا، اگرچہ وہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطق زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری

سے مگر دلائلِ زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہلِ محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبّہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے مگر باہر روکے گئے کیونکہ ہر چند ان کے جبّے دامنِ قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبدِ فلک کا نمونہ تھے مگر اکثر اُن میں طبلِ تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ اُن کے ساتھ انبوہِ کثیر علما و فضلا کا ہولیا۔ پہلا بادشاہ اُن میں ہارون الرشید اور دوسرا مامون الرشید تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا ۔ ولایتی اِستخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ، خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اِس کے پاس تھے مگر چونکہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھے۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان ، حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔

اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہلِ اسلام کا رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملتا تھا اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہوگئے مگر تمام علما و فضلا میں تکرار اور قیل وقال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اس پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہِ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مُصوّر ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مُصوّر ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں البتہ انتخاب ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔

چنانچہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریانی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔

اسی عرصے میں چنگیز خان آیا۔ اس کے لیے گو، علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جوہردار سند کے طور پر پیش کی جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا۔ ''سلطنت میں میراث نہیں چلتی''۔ علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بُو آئے۔ وہ قصاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصورانِ تصانیف کی تحریر نے رنگِ بقانہ ڈالا ہو، اسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورۂ چنگیز خان یعنی اس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو، مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اس کا نام ہلاکو خان تھا۔ اس کے لیے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا مگر ایک مردِ بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب، دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی، محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہہ کہ اپنے پاس بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہِ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی

مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ، آزاد وضع قطع تعلق کا لباس بر میں خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مؤرخ اور شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا ''معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے'' اور فی الحقیقت تو وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہل دربار کا شوقِ طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں سے کسی کو دودھ، کسی کو شربت، کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اِس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظِ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلکِ مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے، دور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول، غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد نورانی صورت، جس کی سفید داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا، اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ، دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر انھیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی ''گلستان'' اور ''بوستان'' کو نہ جانتا تھا اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے ''دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں''۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرے سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی، جس پر تیموری تمغہ بھی تھا۔ گھسیٹ لی اور

بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہِ کثیر، ایرانی، تورانی اور ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہلِ دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضا مندیٔ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت کے حروف لکھے تھے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور، نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی، پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا، اس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا، اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھ کھلتی تھی تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہجہان بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میرِ عمارت ان عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لیے ہوئے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سیکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضا مندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا مگر ایک جوان آنکھوں سے اندھا، چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار، شاہجہان کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔

اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا، بدنیتی اور خودغرضی سے نہیں کیا، بلکہ خلاقِ خدا

کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطینِ چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویّا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ عَلَم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں، مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیرِ ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو! نکالو! ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحدِ روم سے بخارا تک فتح کر کے تاجِ ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خان کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انھیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا، اس کے منھ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق، زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سوداؔ تھے۔

میرؔ بدماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آوازِ دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میرؔ حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم، ذی وقار، متقی و پرہیزگار۔ دم میں ڈاڑھی چٹ، بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جراؔت کو کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسؔخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلمکاری اُس کی عینک کی محتاج تھی مگر آتشؔ کی آتش بیانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومنؔ کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے، جراؔت کی طرف دیکھتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس، جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے مگر ایک لکھنو کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور اُن سے دست و گریباں ہو جاتے لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی "چار درویش" کے مصنف تھے اور بانکے صاحب میرزا سرور "فسانہ عجائب" والے تھے۔ ذوقؔ کے آنے پر پسندِ عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس۔ اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے مگر وہاں سے پھر کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے، بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غُل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اسے دربارِ شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مُردوں میں سے زندوں تو آیا۔

(نیرنگِ خیال)

مشق

۱۔ درج ذیل جُملے کس شاعر یا ادیب کے بارے میں کہے گئے؟

(الف) کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

(ب) اپنی سحربیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔

(ج) اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔

(د) لیکن چار خاکسار اور پانچواں فاصلہ تاجداران کے ساتھ تھے۔

(د) ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔

۲۔ درج ذیل جملے کن بادشاہان یا مشاہیر کے بارے میں ہیں:؟

(الف) جس کے کپڑوں میں لہو کی بُو آئے، وہ قصاب ہے۔

(ب) اِس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔

(ج) رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔

(د) قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔

(ہ) ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے ہاتھ میں تھے۔

۳۔ **درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔**

(الف) مصنف نے بقائے دوام کی کتنی قسمیں بتائی ہیں؟ وضاحت کریں۔

(ب) خوبصورت عورتیں درحقیقت کون تھیں؟

(ج) ایرانی شعرا کو دربار میں کیوں نہیں آنے دیا گیا؟

(د) "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" سے کیا مراد ہے؟

(ہ) شیخ سعدی کیا کہتے ہوئے باہر چلے گئے؟